© rasailojaraid.com

امریکی خارجہ پالیسی اور اسلام ــــ کوسووا کے بعد

جان ایل اسپوزیٹو اور ولی رضا نصر*

ترجمہ: سید راشد بخاری

گزشتہ دو دہائیوں سے جس عنصر نے امریکی خارجہ پالیسی کو شدت اور تسلسل کے ساتھ متاثر کیا ہے وہ اسلام ہے۔ کوئی اور مسئلہ ایسا نہیں جو اتنی شدت کے ساتھ امریکی خارجہ پالیسی سازوں کے ذہنوں پر چھایا رہا ہو اور جس سے ایک مسلسل ردِعمل ابھرا ہو۔ ان کے اس ردِعمل سے ایک ایسی ''غیر رسمی پالیسی'' تشکیل پائی جس کا مقصد نہ صرف اسلام کا راستہ روکنا رہا ہے بلکہ جس سے ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی اور تہذیبی کشمکش کے وقوع پذیر ہونے کا تاثر ملتا ہے۔ تاہم سرکاری طور پر واشنگٹن نے زیادہ لچک دار موقف کا اظہار کیا۔ خاص طور پر یہ کہ 'اسلام سے کوئی مخاصمت نہیں ہے لیکن اسلام پسندی یا سیاسی اسلام (جسے عام طور پر اسلامی بنیاد پرستی سے تعبیر کیا جاتا ہے) کے بارے میں فکرمندی اور تشویش ہے'۔

کوسووا کے واقعات کے بعد اب وقت ہے کہ اسلام کے حوالے سے امریکی خارجہ پالیسی کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے، جن مفروضوں کی بنیاد پر یہ پالیسی تشکیل پائی تھی ان کا پھر سے تجزیہ کیا جائے، اس کے موثر اور مفید ہونے کے بارے میں رائے قائم کی جائے اور کوئی نیا طرزِعمل اختیار کرنے کے امکانات پر غور کیا جائے۔ کوسووا ایک یورپی بحران تھا جس نے اولاً انسانی بنیادوں پر امریکہ کی توجہ حاصل کی اور بالآخر امریکہ کی جانب سے تزویراتی ردِعمل (strategic response) حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ شروع میں مذہب کی حیثیت فیصلہ کن نہ تھی۔ کوسووا واضح طور پر کسی مسلم آبادی کے لیے کسی عیسائی ریاست کے خلاف امریکی مدد حاصل کرنے کی ایک منفرد مثال کے طور پر سامنے آیا ہے۔ جس میں امریکہ کا مسلم گوریلا فوج کے ساتھ اتحاد ایک نہایت ہی اہم واقعہ ہے۔ کوسووا کے مسئلے کے حل کے لیے

* John L. Esposito and Vali R. Nasr, "Rethinking U.S. Foreign Policy and Islam after Kosovo", *Georgetown Journal of Internal Affairs* (online) http://data.georgetown.edu/publications/journal/1-2.htm.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

[امریکی] مداخلت اس وقت رونما ہوئی جب گزشتہ دہائی میں مسلم معاشروں میں بین الاقوامی اور مقامی سطح پر اہم سیاسی تبدیلیوں کا عمل آخری مرحلوں میں تھا۔اس وقت امریکی پالیسی سازوں کو یہ چیلنج درپیش تھا کہ کس طرح مقامی، علاقائی اور بین الاقوامی سیاست میں اسلام کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے پیشِ نظر اپنی خارجہ پالیسی تشکیل دیں۔ بین الاقوامی امور میں اسلام کو حاصل ہونے والی اہمیت اور ایسے علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کی کثیر تعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے جو مغربی اور امریکی مفادات پر اثر انداز ہوتے ہیں، اسلام کے حوالے سے امریکی پالیسی پر نئے سرے سے غور کرنا ایک خوش گوار پیش رفت ہوسکتی ہے۔

حالیہ پالیسی ۱۹۹۲ء میں بش انتظامیہ کے دور میں تشکیل پائی۔ اس پالیسی کی وضاحت ایڈورڈ جرجیان کے ایک بیان سے ہوتی ہے جو اس وقت نائب وزیر خارجہ برائے مشرقِ قریب وشمالی افریقہ امور تھے۔اس بیان کی توثیق بعد میں کلنٹن انتظامیہ میں جرجیان کی جگہ لینے والے رابرٹ پلیٹرو نے بھی کی۔ جرجیان نے اس بات پر زور دیا تھا کہ امریکہ اسلام یا اسلامی تحریکات کو اپنا دشمن نہیں سمجھتا۔ وہ ان تحریکات کی سیاسی عمل میں شرکت کے حق کو بھی تسلیم کرتا ہے بشرط یہ کہ وہ ان جمہوری انتخابات کو طاقت یا اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے استعمال نہ کریں۔یعنی ''ایک شخص، ایک ووٹ، ایک بار'' کے اصول کے تحت اقتدار پر قابض نہ ہو جائیں۔پلیٹرو کا یہ بھی خیال تھا کہ ''اخبار کے عام قارئین کے ذہن میں اسلام کا امیج ایک ایسی تحریک کا ہے جو مغرب کی مخالف ہے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تشدد اور دہشت گردی کا راستہ اختیار کرنے کو تیار رہتی ہے''۔

پلیٹرو نے اسلام پسندوں میں سے کئی ایسے [اپنی جگہ] ''جائز اور سماجی طور پر ذمہ دار مسلمان گروہوں'' کی بات کی ''جن کے سیاسی مقاصد ہیں اور جو قانون کے دائرے سے باہر کام کرتے ہیں''۔ انہیں ''بجا طور پر انتہا پسند کہا جاتا ہے''، اور دیگر انتہا پسندوں کی طرح وہ ''سیکولر بھی ہو سکتے ہیں اور مذہبی بھی''۔ پلیٹرو یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کچھ اسلامی گروہ اپنے ملکوں کے نظام کے تحت اس میں شرکت کرتے ہیں جبکہ دوسرے موجودہ حکومتوں اور وہاں کے شہریوں کے خلاف تشدد کا حربہ استعمال کرتے ہیں۔ جرجیان کی طرح ان کا کہنا بھی یہی ہے کہ ''ہمیں ان کے بارے میں تشویش ہے جو جمہوری عمل کو اقتدار میں آنے کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں صرف اس لیے کہ اس نظام کو تباہ کر کے طاقت اور سیاسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غلبہ حاصل کر لیا جائے''۔

جرجیان کے ۱۹۹۲ء کے بیان اور بعد میں امریکی خارجہ پالیسی سازوں کے بیانات سامنے رکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ امریکی پالیسی کے خدوخال تبدیل ہو رہے ہیں، خاص طور پر جب وہ اسلام اور اسلام پسندی، اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں میں تفریق کرتے ہیں۔ تاہم پالیسی بیانات سے قطع نظر خود امریکی پالیسی میں اس طرح کے امتیاز کا ادراک کم ہی نظر آتا ہے، جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۲ء سے اب تک امریکہ نے کسی ایک بھی اعتدال پسند اسلامی طاقت [گروہ یا جماعت] کی نشان دہی نہیں کی ہے جو اس کے نزدیک سیاسی عمل میں شرکت کی حق دار ٹھہرے۔ نہ ہی امریکہ نے مصر میں اخوان المسلمون یا حزب الوسط کے اس حق کا کبھی دفاع کیا ہے کہ وہ بھی انتخابات میں حصہ لے سکتی ہیں۔ حتیٰ کہ امریکہ نے تیونس کے اسلام پسند رہنما راشد غنوشی کو ویزہ دینا بھی منظور نہیں کیا، جن کے اسلام اور جمہوریت کے بارے میں خیالات جرجیان اور پلیٹر یو کے معیار پر پورا ترتے ہیں، اور جنہیں پلیٹر یو نے ایک قابل قبول اسلام پسند قرار دیا تھا۔

ایران کا سایہ بہت گہرا ہے۔ ۱۹۷۹ء کے ایرانی انقلاب کے بعد سے اسلامی انتہا پسندی امریکی خارجہ پالیسی کے لیے ایک مسلسل دردِ سر بنی ہوئی ہے۔ آیت اللہ خمینی سے اسامہ بن لادن اور حزب اللہ سے اسلامی جہاد تک مغرب مخالف سخت گیروں، نظریہ پرستوں اور عسکریت پسندوں کی ایک لمبی قطار ہے جس نے امریکی مفادات کے لیے اسلام پسندی کے چیلنج کی نوعیت اور وسعت کا واضح مظاہرہ کیا ہے۔ اس عمل میں وہ امریکہ کے لیے ایک واحد ''اسلامی'' پالیسی تشکیل دیتے نظر آتے ہیں۔ مغرب میں اس کا خاصا ردِعمل ہوا ہے۔ سیموئیل ہنٹنگٹن کا ''تہذیبوں کے تصادم'' کا نظریہ اس ردِعمل کی علمی یا فکری انتہا کو ظاہر کرتا ہے۔ ہنٹنگٹن ''اسلام کی خونی سرحدوں'' کی بات کرتے ہیں۔ ان کا یہ نظریہ ایک منطقی نتیجہ کے طور پر خارجہ پالیسی کا حصہ بن گیا، جو مورخ علی مزروعی کے خیال میں ''امریکی خارجہ پالیسی کو اسلامیانے'' (Islamization of the American Foreign Policy) کے مترادف ہے۔

مزروعی مزید کہتے ہیں کہ ''اسلام اور اسلام پسندی کے بارے میں مغرب کا ایسا رویہ اختیار کرنا جیسے باقی سب دنیا مغرب کے مقابل صف آراء ہے (West versus the rest) مسلمانوں کی اس قدیم سوچ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے مماثلت رکھتا ہے جس کے تحت انہوں نے دنیا کی تقسیم ''دارالاسلام'' اور ''دارالحرب'' کے دائروں میں کی تھی۔

مغرب کا یہ طرزِ فکر ریگن انتظامیہ کے دور کے اوائل میں اپنے عروج پر پہنچا۔ امریکہ مخالف حملوں کی لہر کے ساتھ ہی، خصوصاً لبنان میں امریکی بحری بیڑے پر خودکش بمباری کے بعد ''ہم بمقابلہ وہ'' کی سوچ سیاسی طور پر بہت مقبول ہوئی۔ اب نئے دشمن ''اسلامی بنیاد پرستی'' نے امریکی خارجہ پالیسی میں ''بری سلطنت'' (Evil Empire) کی جگہ لے لی۔ بش انتظامیہ میں نائب صدر ڈان کوائل نے بھی اس سوچ کو تقویت پہنچائی اور ان کے ساتھ ساتھ میڈیا اور سیاسی تجزیہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد نے بھی اسلامی بنیاد پرستی کو نازی ازم اور کمیونزم کے ابتدائی خطرے کے متوازی قرار دیا۔

اس چیلنج کے مقابلے میں، جو بظاہر براہِ راست نظر آتا ہے، مذکورہ بالا واضح ثنائی سوچ (binary vision) کی قیمت ہمیشہ زیادہ ادا کرنی پڑی ہے۔ امریکی موقف اسلامی انتہا پسندوں کے تمام دعووں کو مبنی بر حقیقت تسلیم کرتے ہوئے اختیار کیا گیا۔ اسلامی انتہا پسند پورے اسلام کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان کا اصرار ہے کہ مغرب کے بارے میں ان کا موقف ہی سب مسلمانوں اور اسلام کا واحد موقف ہے۔ امریکہ نے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ وہ اسی کو ''اسلامی'' موقف تسلیم کرنے پر آمادہ ہے۔ خاص طور پر ایران میں آیت اللہ خمینی کے دور میں یہی صورت حال رہی اور انہیں اسلام کا واحد ترجمان تصور کر لیا گیا۔ سلمان رشدی کے مسئلے کے دوران نیویارک ٹائمز کی اس سرخی سے یہی اظہار ہوتا ہے، ''اسلام جس کی قیادت خمینی کر رہے ہیں''۔

اسلام کو ایران اور خمینی کے معیار سے دیکھتے ہوئے بہت سے لوگ اسلام کے تمام اظہارات کو ایرانی طرز کی بنیاد پرستی کے خطرے تک محدود کر دیتے ہیں۔ اسی طرح مصر اور الجزائر جیسی سنی ریاستوں میں اسلام پسند حزبِ اختلاف کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایرانی طرز کا انقلاب لانے اور اسی طرح حکومتوں کو تبدیل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ الجزائر میں ایسے دانش ور ہیں جو عباسی مدنی کو دوسرا خمینی کہتے ہیں اور سوڈان کے حسن ترابی کو ''افریقہ کا آیت اللہ'' کہا جاتا ہے۔ اس طرح، اکثر غیر دانش مندی سے، مغربی میڈیا اور پالیسی ساز انتہا پسند اسلام کے تصور کو پروان چڑھانے کا باعث بنتے ہیں۔ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امریکی ردِعمل سے فائدہ اٹھانے والے صرف اسلامی انتہا پسند ہی نہیں ہیں بلکہ مسلم دنیا کے آمروں اور مستبد حکمرانوں نے بھی جلد ہی یہ راز پالیا کہ اسلام پسندی کے حقیقی یا غیر حقیقی خطرے کا اظہار کر کے وہ نہ صرف امریکی حمایت اور امداد حاصل کر سکتے ہیں بلکہ اس طرح جمہوری عمل کے لیے خود پر دباؤ میں بھی کمی کی جا سکتی ہے اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر بھی چھوٹ مل سکتی ہے۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ ایسا اس وقت ہوا جب لاطینی امریکہ اور مشرقی ایشیاء میں جمہوری عمل کی حوصلہ افزائی اور اس کے نفاذ کی کوششیں کرتے ہوئے استبدادیت کی حمایت کی امریکی پالیسی بڑی بنیادی تبدیلی سے گزر رہی تھی۔ ستر کی دہائی میں کمیونزم کے آسیب کو استعمال کرتے ہوئے بہت سے مسلم آمر امریکی حمایت اور امداد حاصل کرنے کے طریقے سیکھ چکے تھے۔ الجزائر، مصر، ترکی، مغربی کنارہ، غزہ اور ازبکستان سبھی اپنے اوپر اسلامی خطرہ منڈلانے کا واویلا کرتے ہیں اور اس طرح اپنے ہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں، شہری آزادیوں کی معطلی، بدامنی، اور اپنی آمریت کو مزید مضبوط اور جائز بنانے کا جواز پیدا کرتے ہیں۔ اکثر اوقات، جیسے تیونس اور مصر کے انتخابات میں، جمہوری قوتیں حکمرانوں کا اصل ہدف بنتی ہیں نہ کہ اسلام پسند۔ الجزائر میں، جہاں امریکہ اور فرانس دونوں ظالم فوجی حکومت کی مدد کرنے میں ضرورت سے زیادہ تیزی دکھاتے ہیں، اسلام پسندی کے خطرے پر جو شدید ردِعمل ظاہر کیا گیا وہ ملک کے لیے تباہ کن ثابت ہوا ہے۔ اور شائد ایک پوری نسل کے لیے استحکام اور ترقی کے امکانات معدوم ہو چکے ہیں۔ چند مسلمان راہنماؤں مثلاً اردن کے شاہ حسین [مرحوم] اور مراکش کے شاہ حسن یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں کہ [دوسروں کو مسترد کرنے کی] اس پالیسی کی قیمت بہت زیادہ ہے اور جیسا الجزائر میں ہوا کہ سیاہ اور سفید کے خانوں میں بانٹنے والی اس سوچ کی افادیت ختم ہو چکی ہے، حتیٰ کہ الجزائر کے صدر عبدالعزیز بوطفلیقا بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں اور انہوں نے اسلام پسند قوتوں کی ایک حد تک شرکت کی حمایت کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود الجزائر میں بدامنی کے سائے بہت گہرے ہیں۔ ترکی بھی، اگرچہ زیادہ احتیاط سے، اسی راستے پر چلتا دکھائی دیتا ہے۔

الجزائر میں اسلام پسندی نے سیکولر حکومت کے خلاف جدوجہد میں آخری حد تک جانے کا مظاہرہ کیا۔ تیونس کے اسلام پسند راہنما راشد الغنوشی کے الفاظ میں ''الجزائر کے اسلام پسندوں کا یہ خیال کہ وہ شدید جدوجہد کے ذریعے سیکولر حکومتوں کو اسی طرح ختم کر دیں گے جس طرح انہیں ایران میں ختم کیا گیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا، غلط ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ کئی ممالک مثلاً ترکی، اردن، مصر، مراکش، کویت اور حتیٰ کہ الجزائر کے اسلام پسند بھی موجودہ نظام میں ہی شرکت کرنے پر تیار ہو گئے۔ اگرچہ اسلام پسندوں کی [اس جمہوری عمل میں] شرکت خطرے سے خالی نہیں تاہم مغرب میں اسلام پسندی کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے اور زیادہ شائستہ طرزِ عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس شرکت سے اسلام پسندی ایک ایسے نسبتاً پیچیدہ مظہر میں تبدیل ہو جائے گی جس کی قسمت اور کامیابی کا فیصلہ مختلف النوع مقامی میدانوں میں ہوگا۔ جہاں ایسی اسلامی تحریکات ہیں جو سیاسی نظام کو تہ و بالا کرنا چاہتی ہیں وہاں ایسے اسلام پسند بھی ہیں جو یورو کمیونزم (Euro communism) کی مثال کی پیروی کرنے کے لیے تیار ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ سیاسی اور سماجی حالات میں ایسی تبدیلی رونما ہو جہاں نظریاتی سیاست اور انتہا پسند قوتوں کی حوصلہ شکنی ہو اور کثرتیت (pluralism) کو پروان چڑھنے کے مواقع ملیں۔

اسلام پسندوں کی سیاسی عمل میں شرکت صرف وہاں خطرہ بن سکتی ہے جہاں سیاسی ادارے کمزور ہوں اور ریاستی اختیار اور سلامتی کو درپیش ناجائز چیلنجوں کا سامنا کرنے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں۔ ان اداروں کی کمزوری کی وجہ ان مستبد حکمرانوں کی طرف سے طاقت کا غلط استعمال بھی ہے جنہیں واشنگٹن کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی پالیسی گومگو کا شکار ہے اور [مسلم دنیا میں] آمروں کی حمایت اس لیے کرتی ہے تاکہ اسلام پسندوں کا راستہ روکا جا سکے۔ نتیجتاً مسلم دنیا میں ادارے کمزور ہیں اور اسلام پسندی ایک مستقل چیلنج کے طور پر برقرار ہے۔ مسلمان معاشروں کا اصل مسئلہ اسلام پسندی نہیں بلکہ آمریت ہے۔ واشنگٹن کو یہ چاہیے کہ وہ آمریت کی حمایت کرنے کے بجائے اداروں کی تعمیر اور شہری معاشرے کی ترویج کے لیے کام کرے۔ امریکہ نے یورپ میں یہی راستہ اختیار کیا تھا اور یورپی کمیونسٹ جماعتوں کو سیاسی عمل میں شریک کیا تھا۔

اسلام کے بارے میں امریکی پالیسی ایک طرف تو اسلام کے مرکزی نمائندہ دھارے کے بجائے بڑی حد تک اسلام پسندوں کے بلند بانگ دعووں سے متاثر ہے اور دوسری طرف مسلمان آمروں کے مفادات بھی اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن اگر امریکہ دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُن عوامل کی حوصلہ افزائی کرے جو ان ممالک میں حقیقی استحکام کا باعث بن سکیں تو آگے جا کر یہ چیز خود امریکہ اور اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے اتحادیوں بالخصوص اسرائیل کے بہترین مفاد میں ہے۔

خارجہ پالیسی پر دوبارہ غور کرتے ہوئے یہ بھی اہم ہے کہ مشرقِ وسطیٰ سے باہر نکل کر زیادہ وسعتِ نظری سے دیکھا جائے کیونکہ اسلام اور اسلام پسندوں کے بارے میں واشنگٹن کی سوچ مشرقِ وسطیٰ سے غالب طور پر متاثر رہتی ہے۔ جنوب مشرقی ایشیاء اور افغانستان جنگ میں اسلام کے سیاسی کردار پر نظر ڈالنا بھی بے حد ضروری ہے۔ جنوب مشرقی ایشیاء کے اسلام سے متاثر [مسلمان] حکمرانوں سے امریکہ کے طویل اور قریبی تعلقات رہے ہیں۔ ان روابط کی وسعت اس وقت مزید واضح ہوئی جب انڈونیشیا میں بی جے جیبی وزیر اعظم بنے اور ملائشیا میں انور ابراہیم مہاتیر محمد کے آمرانہ مزاج کا شکار ہو گئے۔

جیبی کو سہارتو سلطنت کو ''اسلامیانے'' کی کوششیں کرنے پر مطعون کیا جاتا ہے جو انہوں نے معاشی قوم پرستی اور اسلامی اصلاح پسندی کی باہم آمیزش کے ذریعے کیں۔ اسی بنا پر انڈونیشیا کی عیسائی اقلیت اور مغرب میں ان کے حمایتی ان سے بدگمان تھے۔ ان کی ناکامی جو بھی ہو لیکن انہوں نے انتخابات اور مشرقی تیمور میں ریفرنڈم کا انصرام کیا۔ ۱۹۹۹ء کے قومی اور صدارتی انتخابات میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انڈونیشیا میں سیاسی عمل میں اسلام کی کسی نہ کسی شکل میں شرکت کے بغیر جمہوریت کا مستقبل ممکن نہیں۔ عبدالرحمن واحد کے بطور صدر، میگاوتی سوئکارنو پتری کے بطور نائب صدر اور امین رئیس کے بطور سپیکر پارلیمنٹ کے انتخاب سے ایک کھلے سیاسی نظام کی طرف رجحان کا واضح اظہار ہوتا ہے جس میں اسلام کا شراکتی کردار ہے۔ واحد اور رئیس انڈونیشیا کی دو بڑی [اسلامی] سماجی اور تعلیمی تنظیموں سے وابستہ رہے ہیں۔ صدر واحد ''نہدۃ العلماء'' کے قائد ہیں جبکہ رئیس ''محمدیہ'' کے سابق راہنما ہیں۔ ان دونوں کے انتخاب سے مغرب میں موجود اس تصور کی نفی ہو جاتی ہے کہ اسلام اور جمہوریت دونوں متضاد یا ایک دوسرے کے متخالف ہیں۔ انڈونیشیا میں امریکہ کا مفاد اس میں ہے کہ انڈونیشیا کی فوج میں جارحانہ سیکولر عناصر کی بجائے وہاں تبدیلی کی قوتوں بشمول اسلامی تحریکات کی حمایت جاری رکھی جائے۔

اسی طرح ملائشیا میں امریکہ اور آئی ایم ایف نے مہاتیر محمد کی بڑھتی ہوئی مغرب مخالفت اور استبداد کی پالیسیوں کے علی الرغم سابق اسلام پسند راہنما انور ابراہیم کی کھل کر حمایت کی ہے۔ انور کو اس لیے اقتدار سے الگ نہیں کیا گیا کہ وہ زیادہ اسلام پسند یا زیادہ مغرب مخالف تھے بلکہ اس لیے کہ وہ مغرب کے زیادہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حمایتی تھے۔ مہاتیر محمد کے آئی ایم ایف کے خلاف نعروں اور ملائشیا کے خلاف نام نہاد عالمی یہودی سازش کے دعوؤں نے پوری مسلم دنیا میں مغرب مخالف قوتوں کے تخیلات کی آبیاری کی ہے۔

جنوب مشرقی ایشیاء میں مہاتیر محمد سے انڈونیشی فوج تک سیکولر قوم پرست راہنما اور ادارے زیادہ مشکلات پیدا کرنے والے اور زیادہ سرکش ثابت ہوئے ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیاء مشرقِ وسطیٰ سے مختلف ہے چنانچہ ان سب کے لیے ایک ہی اسلام پالیسی مناسب نہیں۔ اگر امریکہ مشرق وسطیٰ کے بارے میں اس لچک اور گنجائش کا مظاہرہ کرتا جو اس نے غیر ارادی طور پر جنوب مشرقی ایشیاء میں کیا ہے تو شائد اس کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتا۔

افغانستان ایک اور اہم کیس ہے۔ ۱۹۸۹ء کے بعد سے امریکہ نے افغان جہاد سے خود کو فاصلے پر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے اپنی توجہ زیادہ تر جنگ کے غیر مطلوبہ نتائج پر مرکوز رکھی ہے مثلاً احمد رمزی یوسف، اسامہ بن لادن اور مسلم دنیا کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے کوئی پچیس ہزار مجاہدین، جنہوں نے افغانستان کی جنگ میں حصہ لیا۔ ان میں سے اکثر اپنے ممالک میں حکومت مخالف سرگرمیوں میں پیش پیش ہیں۔ آج امریکہ کے لیے افغان جہاد کی جو بھی قیمت ہو، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اسلام پسندی اور بلاشبہ عسکری اور انتہا پسند اسلام پسندی نے جنگ عظیم دوئم کے بعد سے امریکی خارجہ پالیسی کے سب سے بڑے مسئلے یعنی سرد جنگ کے خاتمے میں براہ راست کردار ادا کیا ہے۔ امریکی خارجہ پالیسی سازوں کو جو اسلام پسندی اور سیاست میں اسلام کے کردار کو محدود کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں، افغانستان کے بارے میں نیا اندازِ فکر اپنانا چاہیے۔ امریکہ نے اس کے برعکس اس پورے تجربے سے اپنے ہاتھ صاف کرنے میں بہت تیزی دکھائی، جس سے جزوی طور پر یہ بھی واضح ہوا کہ کیوں ایک وقت کے اتحادی اتنی تیزی سے سرکش دشمن میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ افغان جہاد کی مدد اور حمایت کرنا امریکی غلطی نہیں تھی لیکن ۱۹۸۹ء میں افغانستان اور پاکستان سے فوراً منہ موڑ لینا اور اسلام کے بارے میں مقابلے کی پالیسی اختیار کر لینا یقیناً بڑی کوتاہ نظری ہے۔

افغان تجربے کا جائزہ لینا بڑا اہم ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ بھارت، روس اور چین کے مقابلے میں اس سے کوئی سبق سیکھا جا سکے۔ مستقبل میں یہ تینوں طاقتیں، کوسوا کے تنازع کے بعد سے امریکہ مخالف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عالمی اتحاد تشکیل دیتی نظر آ رہی ہیں۔ کشمیری، چیچن اور داغستانی علیحدگی پسندوں نے افغان مثال کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی جدوجہد کو جہاد کے طور پر منظم کیا ہے جس کی توثیق کرنے میں بھارتی، روسی اور مغربی میڈیا نے بہت پھرتی دکھائی ہے۔ کشمیری، چیچن اور داغستانی تنازعوں کو اسلامی عسکریت پسندی تک محدود کر دینا کورچشمی ہوگی۔ آنے والے سالوں میں ممکن ہے یہ [رجحان] ہر جگہ پھیلا ہوا نظر آئے، بھارت میں، دیگر روسی ترک جمہوریاؤں میں اور مغربی چینی کیغور میں۔ حالیہ چینی اور روسی کرغز اجلاس (summit) کی کارروائیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں ریاستیں اپنی مسلم آبادیوں کے درمیان بے چینی سے بہت فکر مند ہیں اور ان مسائل کو دہشت گرد اسلام کے طور پر شناخت کر کے ماسکو اور بیجنگ کے لیے واشنگٹن کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ کیا امریکہ کو ان مسائل کو اسی طرح سمجھنا چاہیے جس طرح بھارتی، روسی اور چینی اسے سمجھانا چاہتے ہیں؟ یا امریکہ ان مسلم اقلیتوں کو نئی صدی میں امریکہ، بھارت، روس اور چین کے درمیان غلبے کی جنگ میں اپنے ممکنہ اتحادیوں کے طور دیکھے گا؟

ان تینوں عظیم طاقتوں میں مسلم اقلیتوں اور ان کے ساتھ تنازعے کا سوال، ان کی اپنی سرحدوں میں بھی اور ان کے ہمسایہ ممالک میں بھی، ان ریاستوں کی عالمی حیثیتوں کے لیے نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ ایک قابلِ غور امر یہ بھی ہے کہ بھارت، چین اور روس ایسا محور تشکیل دیتے ہیں جس کی سرحدوں سے مسلم دنیا کے اہم ترین علاقے ملحق ہیں اور یہ سب علاقے جغرو تزویراتی اعتبار سے امریکہ کے لیے بہت اہم ہیں۔

سیموئل ہنٹنگٹن کا یہ خیال کہ ''مغرب کے خلاف اسلام اور کنفیوشس [چینی تہذیب] کا اتحاد ناگزیر ہے''، ممکن ہے کہ غلط ثابت ہو۔ مستقبل میں امکان یہ نظر آتا ہے کہ ایشیاء میں چینی ہندو اتحاد اور یورپ میں سلاف آرتھوڈوکس بلاک کے خلاف مغرب اور اسلام کا اتحاد وجود میں آ جائے گا۔ بوسنیا اور پھر اس سے بھی بڑھ کر کوسووا میں ان اتحادوں کی بنتی ہوئی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ گزشتہ پانچ سالوں کے دوران اگرچہ یورپ میں امریکہ نے اسلام پسندی کی مخالفت جاری رکھی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے نادانستہ طور پر خود کو مسلمانوں کا اتحادی پایا ہے اور یورپ میں اپنے اثر ونفوذ کو برقرار رکھنے اور مغرب میں روس کے مقابلے میں اپنی طاقت میں اضافے کے لیے اس نے مسلمانوں کا دفاع بھی کیا ہے۔

اب تک یورپ میں جو تہذیبی تصادم وقوع پذیر ہوا ہے وہ اسلام اور مغرب کے درمیان نہیں بلکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہلے تو (کروشیا میں) کیتھولسزم (Catholicism) اور سربیائی عیسائی قدامت پرستی (Serbian Orthodoxy) کے درمیان ہوا اور اب عمومی طور پر مغربی اتحاد (امریکہ اور مغربی یورپ) اور ماسکو۔ بلغراد محور کے درمیان ہے، جہاں ثقافتی، تہذیبی مزاحمت موجود ہے۔ ماسکو۔ بلغراد محور کو یونان، مقدونیہ، بلغراد اور یوکرائن کی قدامت پسند عیسائی آبادیوں (Eastern Orthodox) کی حمایت حاصل ہے۔ وسطی اور جنوبی یورپ میں جغرو تزویراتی تبدیلیوں کے پس پشت مخاصمت، عثمانیوں اور یورپیوں (Habsburgs) کے درمیان جنگوں کی یاد نہیں دلاتی بلکہ یہ چوتھی صدی میں مشرقی اور مغربی چرچ کے درمیان ہونے والے تنازعے کا اعادہ ہے۔ یہاں کئی ایسے بھی ہیں جو بوسنیا خصوصاً کوسووا میں افغانستان کا عکس دیکھ رہے ہیں۔ سربیائی پراپیگنڈا مشین اور مثلاً ریاست کیلی فورنیا کے سینیٹر ٹام ہیڈن یہی سبق دہراتے ہوئے امریکہ کی گوشمالی کرتے ہیں کہ اس نے کوسووا میں مسلمانوں کی حفاظت کے لیے عیسائیوں پر بمباری کیوں کی۔ ہیڈن کے ایل اے (Ksosovo Liberation Army) پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ اسامہ بن لادن کے نظریات کی پیروکار ہے۔ یہ حقیقت بہرحال اپنی جگہ موجود ہے کہ امریکہ نے مشرقی یورپ سے مسلمانوں کے انخلاء کو روکا ہے۔ امریکہ ہی وہ واحد طاقت تھا جس نے بوسنیا اور البانیہ کے مسلمانوں کے اس دعوے کو تسلیم کیا کہ وہ یورپی ہیں اور یورپ میں رہنے کا حق رکھتے ہیں۔ یہاں سے ہی کوسووا اور افغانستان میں فرق ظاہر ہوتا ہے۔ بوسنیا اور کوسووا میں امریکی کردار خفیہ یا پراسرار نہیں تھا اسی لیے یہاں قائم ہونے والے روابط بھی اتنے کمزور نہیں ہیں۔

کوسووا کے مسئلے کا جائزہ ایک اور پہلو سے لینا بھی نہایت اہم ہے۔ امریکہ اور البانیہ نے ایک اتحاد کی تشکیل کے لیے اپنے تہذیبی تضادات کو نظر انداز کر دیا تا کہ مشرقی یورپ میں مسلمانوں کی موجودگی کو یقینی بنایا جا سکے۔ کوسووا کے مسئلہ میں مسلمانوں کا راستہ کسی شدید تہذیبی وابستگی نے متعین نہیں کیا تھا نہ ہی اسلام اور مغرب کے مابین کسی تہذیبی کشمکش نے ان کی راہ عمل کا تعین کیا۔ مسلمان ممالک اسلام کا جھنڈا لے کر کوسووا کے باشندوں کی امداد کے لیے نہیں آئے۔ درحقیقت، کم از کم آغاز میں، مسلم دارالحکومتوں (خاص کر بغداد اور طرابلس) کے عوامی حمایت کے بیانات کے ایل اے کی نسبت ملاسووچ کے لیے زیادہ آئے۔ حتیٰ کہ ایران میں بھی اسلام پسندوں نے کوسووا کے باشندوں کی کھلی حمایت کرنے سے احتراز کیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درحقیقت ایران نے مسلم علیحدگی پسند قوتوں کے مقابلے میں عیسائی حکومتوں کی اکثر حمایت کی ہے۔ ایران وہ آخری مسلمان ملک تھا جس نے آذربائیجان اور وسط ایشیائی ریاستوں کی آزادی کی حمایت کی۔ اولاً ایران نے سوویت یونین کے مستقبل کے لیے گورباچوف کی فکر کی حمایت کو ترجیح دی تھی۔ حال ہی میں ایران نے چیچنیا اور داغستان کے معاملہ میں روسی موقف کی حمایت کی ہے یا پھر روسی مظالم پر خاموشی اختیار کرنا زیادہ مناسب سمجھا ہے۔ ۱۹۹۹ء کے اواخر میں روسی چیچن تنازع کے دوران ایرانی وزیر خارجہ کمال خرازی نے روس کو چیچنیا پر حکومت کرنے کے روسی موقف کی مکمل حمایت اور تعاون کا یقین دلایا تھا۔ اسی طرح ایران نے نگورنو کاراباخ کے تنازع میں آذری شیعوں کے مقابلے میں آرمینیا کی حمایت کی اور اس طرح ثابت کیا کہ اسلامی جمہوریہ ایران کے نزدیک تہذیبی وفاداری کی نسبت قومی مفادات زیادہ اہم ہیں۔

حیرت انگیز طور پر ملکی مفادات کی اس پیروی سے مسلم آبادیوں کی جبینوں پر اتنی شکنیں نہیں آئیں جتنی توقع تھی۔ کوسووا کے مہاجرین کے لیے اتنی امداد مسلمان ممالک کی طرف سے نہیں آئی جتنی امداد یورپیوں اور امریکیوں نے کی۔ کوسووا ہمیشہ یورپ کا ایک انسانی المیہ رہا نہ کہ کوئی اسلامی مسئلہ۔ کوسووا کے تجربے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی رویوں کے بارے میں تہذیبی وفاداریوں کی اصطلاح میں کوئی قطعی نتیجہ اخذ کرنا ممکن نہیں۔ مغرب عموماً مسلمانوں کے رویوں کے بارے میں حقیقت کے بجائے بے معنی روایتوں اور افسانوں کا اثر جلدی قبول کر لیتا ہے۔ اس نکتے کی مزید وضاحت مشرقی تیمور میں حالیہ اقدامات سے ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے سب سے زیادہ آبادی والی مسلمان ریاست انڈونیشیا میں علیحدگی کے اس واقعے پر جو تشویش ظاہر کی وہ توقع سے بے حد کم تھی۔ ان کے مقابلے میں کیتھولک مسیحیوں (Catholicism) نے مشرقی تیمور کی حمایت میں کہیں زیادہ تہذیبی تفاوت پر مبنی سوچ کا مظاہرہ کیا۔ مشرقی تیمور [کی علیحدگی] کے مقصد کی تبلیغ و وکالت ۱۹۷۵ء سے وسیع بنیادوں پر بین الاقوامی نیٹ ورک کے ذریعے کی جا رہی تھی۔ اس تبلیغ اور وکالت کا دائرہ ویٹیکن سے امریکہ کے ایوان نمائندگان اور کیتھولک کالجوں اور یونیورسٹیوں تک وسیع تھا۔ جتنے ملاؤں نے کوسووا کے لیے کام کیا ان سے کہیں زیادہ تعداد میں بشپ نہ صرف مشرقی تیمور بلکہ دیگر ممالک میں بھی مشرقی تیمور کی آزادی کے لیے مصروف کار رہے۔ کوسووا میں بھی مسلمان نہیں بلکہ یہ سلاف تھے جو تہذیبی تصادم کی سوچ سے راہنمائی حاصل کر رہے تھے۔ وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سلاف اساطیر (myths) سے متاثر ہو کر سربیا، یونان اور روس میں ایسے پان - آرتھوڈوکس کی ترویج چاہتے تھے جو بلغراد کے راستے ایتھنز سے ماسکو تک پھیلا ہوا ہو۔

کوسووا امریکی خارجہ پالیسی کی بڑی کامیابی ہے۔ نظری اور فکری سطح پر اس کامیابی نے ''اسلام بمقابلہ مغرب'' کے مفروضوں کو بڑی حد تک باطل کر دیا ہے۔ واشنگٹن میں ۱۹۷۹ء سے انھی مفروضوں پر مبنی پالیسی کا غلبہ تھا۔ جبکہ عملی سطح پر کوسووا کی مثال سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ اسلام پسندی اور مسلمانوں اور مغرب کے درمیان تعلقات اتنے پیچیدہ ہیں کہ انہیں دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والی قطعی سوچ کے ذریعے نہیں سمجھا جا سکتا۔

امریکہ کی اسلام پالیسی کو سمجھنے کے لیے ان مفروضوں کا جائزہ لینا بھی نہایت اہم ہے جن کی بنیاد پر یہ پالیسی تشکیل پائی ہے۔ شروع میں اسلام پسندی کا راستہ روکنے کا مطلب یہ تھا کہ شیعت کا راستہ روکا جائے۔ اسلامی خطرہ اولاً در اصل شیعہ خطرہ تھا۔ ایران طویل عرصے تک امریکہ کے لیے واحد بڑا خطرہ بنا رہا اور اب بھی [مشرقِ وسطیٰ میں] حزب اللہ اور حماس کی حمایت کی وجہ سے اسرائیل ایران کو ہی بڑا خطرہ قرار دیتا ہے۔ اسرائیل کے سابق وزیر اعظم شمعون پیریز نے شرم الشیخ میں تہران کو ''دہشت گردی کا دارالحکومت [گڑھ]'' قرار دیا تھا۔ اسی طرح لبنان میں شیعہ حزب اللہ نے امریکہ اور اسرائیل کو انخلاء پر مجبور کیا اور ابھی تک اسرائیل کے خلاف واحد اور موثر عرب عسکری قوت بنی ہوئی ہے۔

نتیجے کے طور پر شیعت کو اسلام کی سب سے زیادہ انقلابی اور عسکری قوت کے طور پر دیکھا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ امریکہ نے جنگ خلیج کے بعد عراقی شیعوں کی امداد میں کمی کر دی۔ ۱۹۹۱ء میں جب جنوبی عراق میں سرکاری فوج (Iraqi Republican Guards) شیعہ تحریک کو کچلنے کے لیے آگے بڑھی تو امریکہ شیعوں کی طرف سے مدد کی اپیلوں کے باوجود ٹس سے مس نہ ہوا۔ واشنگٹن میں امریکی پالیسی ساز ٹائم میگزین کی اس طرح کی سرخیوں کے اسیر رہے مثلاً ''شیعوں کی طرف سے امریکہ کی تاریخی مخالفت''۔ بحرین میں جب شیعہ حزب اختلاف کو کچلا جا رہا تھا تو امریکہ اور یورپ نے اسی تناظر میں حکومتی سطح پر بھی اور میڈیا میں بھی خاموشی اختیار کی۔

سنی بنیاد پرستی یا اسلام پسندی کو عملاً کم تر برائی سمجھا گیا۔ کئی مثالیں ہیں جن میں اسلام پسندی ایران

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی غلبے کی خواہش کے برعکس، اپنے داخلی معاملات میں الجھی رہی۔ اس کے اتار چڑھاؤ کو عموماً سعودی عرب، پاکستان یا ملائشیا کی حکومتیں کنٹرول کرتی رہی ہیں۔ ان کا عرب ریاستوں سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ جیسا کہ شام میں ۱۹۸۲ء میں واضح ہوگیا (جب حافظ الاسد نے اخوان المسلمون کی تحریک کو کچلنے کے لیے ''حمص'' کا پورا شہر برابر کر دیا تھا جس میں ایک لاکھ سے زیادہ افراد ہلاک ہو گئے تھے)۔ دیگر اسی طرح کی بڑی مثالوں میں تیونس، الجزائر اور مصر قابل ذکر ہیں۔ درحقیقت امریکہ کو کوئی سنی مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ ان مسلمانوں کے ساتھ تعلقات عامہ (پبلک ریلیشنز) کا مسئلہ ہے، جو امریکہ پر جمہوریت کے فروغ کی کوششوں میں دوہرا معیار اختیار کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ امریکہ جمہوریت کے فروغ کے لیے روس، مشرقی یورپ، لاطینی امریکہ اور افریقہ میں تو کوششیں کر رہا ہے لیکن [مشرق وسطیٰ کی] ان ریاستوں کے معاملے میں (جو زیادہ تر اپنی انٹیلی جنس ایجنسیوں پر انحصار کرتی ہیں) اگر خاموشی نہیں تو دہرا رویہ ضرور اختیار کرتا ہے جو انتہا پسندی کی روک تھام کے نام پر جمہوریت کو کچل رہی ہیں۔ انہی وجوہات کی بنا پر امریکہ نے سعودی عرب کی طرف سے سنی عسکریت پسندی کے لیے خاطر خواہ مالی امداد پر آنکھیں بند کر رکھی ہیں، کیونکہ اس کا مقصد وسطی ایشیاء سے خلیج فارس تک ایران [کے اثر و رسوخ] کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کرنا ہے۔ آج جب ایرانی انقلاب مدھم پڑ گیا ہے اور ملک اپنی داخلی اور بین الاقوامی سیاست میں حالات کو معمول پر لانے (normalization) کی سمت قدم بڑھا رہا ہے تو سنی عسکریت پسندی اس کی جگہ لینے کے لیے تیار کھڑی ہے۔ طالبان، کشمیر میں حرکت المجاہدین، اسامہ بن لادن اور احمد رمزی یوسف کا نیٹ ورک اور مسلم دنیا کے مختلف حصوں میں ان کے دیگر ساتھی عسکریت پسندی کے ایک نئے دور کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ اور اس عسکریت پسندی کی نوعیت فرقہ وارانہ ہے۔ اس کی جڑ سنی عسکریت پسندی میں ہے جو شیعہ مخالف ہے اور بتدریج اب اس کی توجہ مغرب کی طرف مبذول ہو رہی ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان میں وہی سنی عسکریت پسند طاقتیں ابھی تک جن کی توجہ داخلی مسائل پر تھی، اب امریکہ کی اسامہ بن لادن دشمنی کی وجہ سے امریکی مفادات کے لیے براہ راست خطرہ بن رہی ہیں۔ سنی عسکریت پسندی کی یہ نئی شکل، جس کی تخلیق میں امریکہ اور اس کے علاقائی ساتھیوں کا بھی حصہ ہے، اسلام پسندوں کی انتہا پسند سیاست میں بڑی تیزی سے شیعیت کی جگہ لے رہی ہے۔ ابھی بھی وقت ہے امریکہ کو ''اسلامی خطرے'' کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائزہ لیتے ہوئے ان گہرے مضمرات کو ضرور نظر میں رکھنا چاہیے جو حقیقت کا روپ دھار رہے ہیں۔ بھارت، پاکستان، افغانستان، چیچنیا، وسطی ایشیا اور خلیج فارس میں جوں جوں سنی عسکریت پسندی میں اضافہ ہو رہا ہے، امریکہ کو ممکن ہے ایک اور عنصر سے واسطہ پڑے یعنی شیعہ سنی تنازع۔ مزار شریف اور بامیان میں طالبان کی طرف سے شیعوں کے قتل عام اور ایران افغانستان سرحد پر فوجوں کی تیاری سے اس تنازعے کی شروعات ہو چکی ہیں۔

اس تنازعے میں امریکی مفادات کہاں ہیں؟ خطرے کی شیعہ ازم سے سنی ازم کی طرف تبدیلی کا مطلب کیا ہے؟ یہ سوالات امریکہ کی اسلام پالیسی پر غور کرتے ہوئے نہایت اہم ہیں، اور پھر یہ بھی کہ کیا امریکہ کو اسلام کے بارے میں ایک ہی [واحد] پالیسی اختیار کرنی چاہیے؟ پاکستان کی علاقائی اور ملکی سیاست میں سنی عسکریت پسندی نے اپنی جو جگہ بنائی ہے اس سے یہ مسئلہ مزید پیچیدہ ہو گیا ہے۔ ۱۹۹۹ء میں پاکستانی فوج نے کشمیر میں کارگل کے مقام پر مداخلت کے لیے سنی عسکری قوتوں کو ایک ڈھال کے طور پر استعمال کیا۔ اس طرح جنوبی ایشیاء کی دو ایٹمی طاقتوں کے درمیان خطرناک کھنچاؤ پیدا ہو گیا اور بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی اور سابق پاکستانی وزیراعظم نواز شریف کے درمیان ایک سال کی سفارت کاری اور اعتماد بحال کرنے کی کوششوں کو نقصان پہنچا۔

پاکستان - بھارت تعلقات میں سنی عسکریت پسندی کا براہ راست کردار بلاشبہ دونوں ممالک کے درمیان مذاکرات کے عمل کو پیچیدہ بنا دے گا۔ انہی عسکری طاقتوں کو جو کارگل میں ملوث تھیں، جنرل پرویز مشرف نے پاکستان میں امن و امان کا بحران پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا تاکہ نواز شریف کی جمہوری طور پر منتخب حکومت کو ختم کیا جا سکے۔ اکتوبر ۱۹۹۹ء کی فوجی بغاوت (coup) برپا ہونے سے پہلے دس روز کے دوران پاکستان میں سنی فرقہ وارانہ گروہوں نے، جن میں کشمیر میں لڑنے والے گوریلے بھی شامل تھے، کوئی ۴۵ شیعہ مذہبی قائدین کو قتل کیا۔ پاکستان میں سیاسی تبدیلی امریکی قومی مفادات کے لیے بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں جو مسائل ہیں ان کا جواب ''اسلام بمقابلہ سیکولرزم'' پر مبنی امریکی خارجہ پالیسی کے ذریعے مناسب طور پر نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے لیے ایک ایسا واقعتاً حقیقت پسندانہ طرز عمل (aproach) اختیار کرنے کی ضرورت ہے جس میں علاقائی اور قومی سیاست میں اسلام کی مختلف جہتوں کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پورا پورا ادراک شامل ہو۔

حالیہ سالوں میں کئی [مسلمان] حکمرانوں نے اسلام کے لیے اپیل کو اپنے اقتدار کے لیے مفید اور موزوں خیال کیا۔ اردن کے شاہ حسین نے داڑھی رکھی۔ اسی طرح ان کے بیٹے عبداللہ ثانی نے بھی داڑھی رکھی ہوئی ہے۔ مراکش کے شاہ حسین نے خود اپنے اعزاز کے لیے ایک عظیم مسجد تعمیر کرائی اسی طرح آذربائیجان کے حیدر علیوف نے مذہب کے لیے اپنی خدمات کی نمائش کے لیے میوزیم تعمیر کرایا ہے۔ کبھی کے سیکولر آمر خود کو ایمان والے صدور (believer presidents) کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ الجزائر کے بوطفلیقا بھی اسلام کی بات ایسے ہی کرتے ہیں جیسے حافظ الاسد یا حسنی مبارک۔ مصر کا حکمران طبقہ بھی ترکی کے سیاست دانوں کی طرح مساجد میں اور نماز کے لیے زیادہ کثرت سے نظر آنے لگا ہے۔ مسلم دنیا میں عوام زیادہ اسلامی ہو گئے ہیں اور ریاست نے از خود اسلامی قانون سازی اور اس کے نفاذ کا کردار سنبھال لیا ہے۔ مثال کے طور پر مصر میں مبارک کی پشت پناہی سے چلنے والے سماجی پروگرام اور اخوان المسلمون کی اپوزیشن کے پروگرام میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ جوں جوں سیکولر حکومتیں اپنے دعووں کے اعتبار سے زیادہ اسلامی ہوتی جا رہی ہیں اور ان پروگراموں کو آگے بڑھانے کا وعدہ کر رہی ہیں جن کا مطالبہ اسلامی حزب اختلاف کرتی ہے، یہ زیادہ واضح ہو رہا ہے کہ اسلام اب کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ مسئلہ آمریت، جمہوریت اور کثرتیت کے درمیان ہے۔ حکومتیں اور ان کے مخالفین اسلام کی سیاسی اور تہذیبی زبان مختلف تناظر میں استعمال کرتے ہیں۔ اسی لیے اقتدار کی جنگ کے مختلف النوع پہلوؤں کو سمجھنے اور بیان کرنے کے لیے اب اسلام واحد اور بڑا حوالہ نہیں رہا۔

بیشتر مسلم دنیا آج بھی آمریت اور معاشی جمود کے شکنجے میں ہے۔ اس سے بہر حال مغرب کے لیے بہت سے چیلنج پیدا ہو سکتے ہیں جو ضروری نہیں کہ اپنے خدوخال اور نوعیت کے اعتبار سے نظریاتی یا اسلام پسندی پر مبنی ہوں۔ ان چیلنجوں کا جواب دینے کے لیے ایسی پالیسیاں وضع کرنی ہوں گی جو تہذیبی کشمکش کو نمایاں کرنے کی بجائے مفادات کو پورا کریں۔ ایسی پالیسیاں، جیسی کوسوو میں اپنائی گئیں، یعنی جو مذہب کا ردِعمل نہ ہوں بلکہ واقعہ کے حسبِ حال ہوں۔ مسلمان ان تجارتی اور جغرو تزویراتی راستوں کے بہت قریب بستے ہیں جو مغرب کے لیے اہم ہیں۔ یہ امریکہ کے مفاد میں نہیں کہ اسلام پسندی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمانوں کو تصویر کشی ایک ہی انداز سے کی جائے یا انہیں ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جائے۔ نہ ہی تہذیبی تفاوت پر مبنی ایسا ردِعمل ظاہر کرنا مفید ہے جیسے اسلامی انتہا پسند کوئی مختلف مگر خطرناک اقلیت ہوں۔ امریکہ کو اسلام پر کوئی موقف اختیار کرنے کی اتنی ضرورت نہیں جتنی ان علاقوں میں ہونے والی سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیوں پر نظر رکھنے کی ہے جہاں مسلمان رہتے ہیں۔ امریکہ کو تہذیبی تصادم کا کوئی خطرہ درپیش نہیں بلکہ اصل خطرہ ان سماجی، معاشی اور سیاسی حقیقتوں سے ہے جو انتہا پسندی کی پرورش کر رہی ہیں۔ امریکہ کو اسی پہلو پر توجہ دینے کی ضرورت ہے اور اسلام، اسلام پسندی اور مسلمانوں کے بارے میں پالیسیاں تشکیل دیتے وقت اسی تناظر کو سامنے رکھنا چاہیے۔

جان ایل اسپوزیٹو "انسائیکلوپیڈیا آف دی ماڈرن اسلامک ورلڈ" کے ایڈیٹر ان چیف ہیں اور کالج آف ہولی کراس سے بطور پروفیسر وابستہ ہیں۔ آپ مڈل ایسٹ اسٹڈیز ایسوسی ایشن کے صدر اور امریکی محکمہ خارجہ کے کنسلٹنٹ بھی رہے ہیں۔ آپ اسلام پر کئی کتب کے مصنف بھی ہیں، چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

"Islam: The Straight Path", "Islam and Politics", "Islam in Asia", "Voices of Resurgent Islam", and "Islam in Transition".

سید ولی رضا نصر یونیورسٹی آف سان تیاگو، کیلی فورنیا، امریکہ میں سیاسیات کے پروفیسر ہیں، آپ نے سید حسین نصر اور ایچ دباشی کے ساتھ شیعت کی تاریخ، عقائد اور روحانیت پر دو کتابیں مرتب / ایڈٹ کی ہیں اور جماعت اسلامی پاکستان پر ایک معروف کتاب Vanguard of Islamic Movements کے مصنف بھی ہیں۔

© rasailojaraid.com